اقبال اور حدیث جبر و قدر

از

ڈاکٹر میر ولی الدین، منشی فاضل، ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن)
بیرسٹر ایٹ لا
استاذ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ

یہ مقالہ مجموعہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ جلد ہشتم میں چھپا

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

اقبال اور حدیثِ جبر و قدر

از

میر ولی الدین

ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا استادِ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مرید ۔ اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر — میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

پیر ۔ "بال بازاں را سوے سلطاں برد — بال زاغاں را بہ گورستاں برد"

(بالِ جبریل)

"میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر"! آغازِ فکرِ انسانی سے یہی آواز بار بار مضطربانہ انداز سے بلند ہوتی رہی ہے لیکن انسان نے اس مسئلہ کو محض نظری کہہ کر اس پر غور و فکر کرنا کبھی ترک نہیں کیا۔ کیوں؟ آخر اس مسئلہ میں جاذبیت کیا ہے؟ اس کے ذکر کے ساتھ ہی عامی سے عامی شخص تک کے کان کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ محض نظری نہیں، ہمارا سارا نظامِ دینیات، سیاسیات، تعلیمات، معاشیات، اور جرمیات اسی مسئلہ کے فہم و ابہام پر مبنی نظر آتا ہے۔

اگر ہم مجبور ہیں تو دینیات ہمیں سمجھائے کہ دوزخ ہمارا ٹھکانا کیوں ہو، جرمیات ہمیں بتائے کہ چور کو سزا دینے کے کیا معنی اور تعلیمات تزکیۂ اخلاق و تصفیۂ قلب پر اتنی مُصر کیوں ہے؟ اگر ہم آزاد ہیں تو پھر بقول اسپنوزا کیوں ہمیں اپنی زبان تک پر بھی اختیار نظر نہیں آتا؟ جذبات کا شر و شور مرد افگن کیوں ہوتا ہے اور عقل شہوات کی غلام کیوں رہی ہے؟ "آتشِ انتقام سے مشتعل ہو کر بچہ بھی تو یہی سمجھتا ہے کہ وہ اپنے دشمن پر آزادانہ حملہ کر رہا ہے، مدہوش شرابی کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کی زبان سے نکل رہا ہے اس میں اس کے اختیار اور مرضی کو پورا دخل ہے گو بعد میں پچھتاتا ہے کہ یہ کیوں اس کی زبان سے نہ نکلی ہوتی!" انسان اپنے کو آزاد و مختار اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کو اپنے افعال کا تو شعور ہوتا ہے لیکن وہ ان اسباب و علل سے جاہل ہے جو ان افعال کا تعین کرتی ہیں"۔

(اسپنوزا)

ہماری رائے میں اس قدیم مسئلہ کے حل میں عقلِ نظری ناکامیاب ہی ہو! یہ مسئلہ اب بھی لاینحل ہے یہ مسئلہ نہیں گتھی ہے! عقل کے اس عجز ہی کو دیکھ کر پیغمبر اسلام (فداہ ابی وامی) نے فرمایا کہ"اذا ذکر القدر فامسکوا"[1] (جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو تم خاموش ہو جاؤ) یہ حکم ہوا عوام کو عالم اور خبیر سے فرمایا گیا" لا تکلموا فی القدر فانہ سر اللہ فلا تفشوا اللہ سرہ"[2] (تقدیر میں گفتگو نہ کیا کرو کیونکہ وہ خدا کا ایک راز ہے پھر اللہ کے راز کا افشا نہ کرو) اس دوسرے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان لوگوں پر اس اہم مسئلہ کو فاش کر دیا ہے جو اس کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں جن کی شان میں فرمایا گیا ہے" لِمَن کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْد"[3]۔ اسلام کے سب سے بڑے صوفی فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی بھی یہی رائے ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"فسر القدر من اجلّ العلوم وما یفہمہ اللہ تعالیٰ الّا لمن اختصہ اللہ بالمعرفۃ التامۃ"[4] سرِ قدر بزرگ ترین علوم سے ہے اور اس سے حق تو سوائے اس کے کسی کو آگاہ نہیں کرتے جس کو انھوں نے معرفت تامہ کے ساتھ مختص کر لیا ہے"!

ہم اقبال سے "سرِ قدر" دریافت کر رہے ہیں۔ اگر اقبال محض شاعر ہوتے تو ہم بھلا اس فلسفیانہ گتھی کو ان سے سلجھانے کیوں جاتے؟ گو اس میں شک نہیں کہ بفحوائے "ان من الشعر لحکمۃ"[5] علوم و حقائق شعراء کے ہاں بھی مل سکتے ہیں لیکن مسئلہ کی عظمت ہمیں ایک شاعر کے ہاں جانے سے روکتی۔ اگر اقبال محض فلسفی ہوتے تو بھی ہم اس مسئلہ پر ان سے بحث کرنے تیار نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں فلسفہ کی کھیتی پکی نظر نہیں آتی۔ اقبال علاوہ سحر بیان شاعر اور جید فلسفی ہونے کے ہمیں عارف بھی نظر آتے ہیں جن پر "صحبت پیر روم" نے بہت سے معارف کا دروازہ کھول دیا تھا مثلاً:۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش | لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ | سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف (بال جبریل)

فلسفہ کی لم ولا تسلم سے اکتا کر انھوں نے اپنے مولیٰ سے معروضہ کیا تھا:۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں | میرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر (")

وہ جان گئے تھے کہ:۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں | اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب | آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن | یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں (")

جب انھیں حضور کی لذت حاصل ہونے لگی تو وہ اب عقلِ نظری کے استدلال سے متنفر نظر آتے ہیں اور "دانش برہانی" میں "حیرت کی فراوانی" کے سوا انھیں کچھ نہیں نظر آتا۔

---

[1] طبرانی عن ابن مسعود کذا فی الجامع الصغیر للسیوطی ۱۲ [2] ابو نعیم فی الحلیۃ کذا فی کنز العمال ۱۲ [3] جس کے پاس دل ہے اور کان لگایا اس حال میں کہ وہ خود حاضر ہے ۱۲ [4] فصوص الحکم شاہ مبارک علی ایڈیشن صفحہ ۱۳۱ فص عزیزیہ [5] بعض اشعار حکمت ہیں (حدیث بخاری)

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل (بال جبریل)

عارف کا مرتبہ و مقام اقبال اچھی طرح جانتے ہیں ؎

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے
لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے! (ر ر)

اقبال کی اس حیثیت سے واقف ہو کر ہم دریافت کر رہے ہیں کہ مدیث جبر و قدر کے متعلق ان کے "پیر" نے انھیں کیا سکھایا ہے؟ جواب میں اقبال کا پوزیشن اس شعر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے ؎

"چنیں فرمودۂ سلطانِ بدر است
کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است" (زبور عجم)

ظاہر ہے کہ اقبال مسئلہ کا صحیح حل وہی سمجھ رہے ہیں جو ان کے آقائے نامدار صلعم نے بیان کیا ہے کہ انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی اور علم صحیح کی بافت اگر ہو سکتی ہے تو اسی طرح کہ راستہ جبر و قدر کے درمیان اختیار کیا جائے۔

پہلے جبر کے پہلو پر نظر کیجئے۔ جس کسی کا خدا پر یقین ہے وہ خدا کو خالق افعال مانے بغیر رہ نہیں سکتا۔ جس طرح خدا ہمارے جسموں اور روحوں کا خالق ہے وہ ہمارے افعال کا بھی خالق ہے۔ یہ عقیدہ قرآن میں بصراحت النص پایا جاتا ہے تو حیتاویل کا امکان تک نہیں۔ ان شواہد پر غور کیجئے۔

اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰہُ بِقَدَرٍ ــــــ وَکُلُّ شَیۡءٍ فَعَلُوۡہُ فِی الزُّبُرِ (۲۹،۵۲ آیت)
"ہم نے ہر چیز بنائی ہے پہلے ٹھیرا کر اور جو چیز انھوں نے کی لکھی ہے ورقوں میں"

"شئی" میں افعال بھی داخل ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ "خالق کل شئی" ہیں لہذا یہ ضروری طور پر لازم آتا ہے کہ وہ افعال کے بھی خالق ہیں۔ اگر افعال مخلوق نہ ہوتے (باوجود اس امر کے کہ ان پر "شئی" کا اطلاق ہوتا ہے) تو پھر حق تعالیٰ بعض اشیاء کے خالق ہوتے اور بعض کے نہ ہوتے اور ان کا یہ قول کہ وہ "ہر شئے کے خالق" ہیں کذب محض ہوتا تعالی اللہ من ذلک علوا کبیرا۔

اس حجت قیاسی کی بھی ہمیں کوئی ضرورت نظر نہیں آتی قرآن میں یہ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ
اور اللہ نے پیدا کیا تمھیں اور جو تم کرتے ہو (سورہ والصفٰت آیت ۹۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے افعال کے خالق ہیں۔ یہ تھا ایجابی طرز بیان، ذرا سلبی طریق گفتگو پر بھی غور کر لیجئے۔

یہاں حق تعالیٰ اس امر سے انکار کر رہے ہیں کہ ان کے سوا کوئی خالق اور بھی ہے۔

"ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللہ خالق کل شیء وھو الواحد القھار"
کیا ٹھہرائے ہیں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہو گئی پیدائش ان کی نظر میں کہہ اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست۔ (سورہ الرعد آیت ۱۶)

اب فرض کیجئے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور انسان اپنے افعال پیدا کرتا ہے۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ افعال افراد انسانیہ سے بہت زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص ان گنت افعال کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہے کہ انسان کی پیدا کردہ چیزیں، جو خود خدا کی مخلوق ہے، اس خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ ہوں گی جو انسان کا خالق ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان قدرتِ تخلیق میں خدا سے بھی زیادہ کامل ہے اور اس کی مخلوق خدا کی مخلوق سے شمار میں کہیں زیادہ ہے! یہ عقیدہ تو صریحاً احمقانہ ہے۔ مخلوق خالق سے زیادہ قوی کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے طور پر یہی ماننا پڑے گا کہ حق تعالیٰ نہ صرف انسان کے خالق ہیں بلکہ اس کے افعال کے بھی۔ "واللہ خلقکم وما تعملون"۔ صرف حق تعالیٰ ہی خالق ہیں، فاعل ہیں، متصرف ہیں۔ لا فاعل فی الوجود الا اللہ۔ ساری کائنات ان کی مخلوق، انسان اور اس کے افعال سب کائنات میں شامل ہیں، لہٰذا یہ سب ان کے مخلوق ہیں۔

جاوید نامہ میں اقبال اسی توحید فی الآثار و توحید فی الافعال کو بیان کر رہے ہیں،

می شناسی طبع ادراک از کجاست؟	جوہرے اندر بنگہ خاک از کجاست؟
طاقتِ فکرِ حکیماں از کجاست؟	قوتِ ذکرِ کلیماں از کجاست؟
ایں دل و آیں وار دات از کیست؟	ایں فنون و معجزات از کیست؟
گرمیٔ گفتار داری؟ از تو نیست!	شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست!
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است	فطرت از پروردگارِ فطرت است!

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کی تائید کلام نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "یا رسول اللہ ارایت ما نعمل فیہ علی امر قد فرغ منہ او امر نبتدأ؟ فقال علی امر قد فرغ منہ، فقال عمر أفلا نتکل وندع العمل، فقال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ" یعنی جس کام میں ہم لگے ہوئے ہیں اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ کام پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے یا ہمیں نے اس کو شروع کیا ہے؟ فرمایا پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے۔ عمرؓ نے کہا تو کیا پھر ہمیں توکل نہیں کرنا چاہئے اور ترکِ عمل نہ کرنا چاہئے" یعنی جب پہلے ہی سے ساری چیزیں مقرر و متعین ہو چکی ہیں تو پھر ہماری کوشش و عمل سے کیا فائدہ؟ رسول اللہؐ نے فرمایا کام کئے جاؤ، ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے"۔ عمرؓ نے کہا "الآن طاب العمل" اور اپنے کام پر لگ گئے۔ تقدیر کے بہانہ سے عمل ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ادائی فرائض میں اب ایک لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ کوشش کو تشویش و فکر سے نجات مل جاتی ہے۔ ہم جان لیتے ہیں کہ "ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے"

ایک اور دفعہ رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ ارایت رقی نسترقیہا و دواء نتداوی بہ ھل یرد من قدر اللہ

لہ صحاح ۱۲

تعالیٰ فقال انہ من قدر اللہ یعنی "جو فعل کہ ہم کرتے ہیں اور جو دوائیں کہ استعمال میں لاتے ہیں کیا یہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں؟ فرمایا کہ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی تقدیر سے ہوتا ہے۔ آپ کا یہ ارشاد تو اور بھی زیادہ صاف اور واضح ہے کہ "لایومن احدکم حتیٰ یومن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس امر پر ایمان نہ لائے کہ خیر و شر کی تخلیق من اللہ ہے۔

تعلیم اسلام میں جبر کا یہ پہلو صاف ہے اور اس سے صرف یہی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شئے کی تخلیق من اللہ ہے۔ اور اقبال یہ کہہ کر "ایں ہمہ فیض از بہار فطرت است۔ فطرت از پروردگار فطرت است" "ہمہ از وست" کے نظریہ کے قائل اور حامی نظر آرہے ہیں۔ لیکن جبر کی یہ ساری تعلیم قدر یا اختیار یا آزادیٔ ارادہ کے منافی نہیں! بظاہر ہماری یہ بات عجیب و غریب نظر آتی ہے، دو متضاد چیزوں میں تطبیق واقعی عجیب بات ہے۔ لیکن قرآن کا یہی اعجاز ہے اور اقبال اس تضاد کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تائید میں میرے یہاں دلائل موجود ہیں۔ پہلے مجھے آزادیٔ ارادہ اور ذمہ داری کے نظریہ کی تشکیل کرنے دیجئے جو قرآن کریم میں پیش کیا گیا ہے "خلق من اللہ" کے دعوی کے ساتھ ساتھ قرآن میں انسان کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اس ظاہر اتضاد کی وجہ سے آپ کو جو ضیق محسوس ہو رہا ہے اس پر ذرا سا صبر کر لیجئے ممکن ہے اس مقالہ کے ختم پر آپ کو تسکین ہو جائے۔

انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ وہ اپنے افعال کا کاسب ہے، اُسی لئے وہ جزا و سزا کا مستحق ہے، اِسی لئے اوامر و نواہی کا نزول ہوا ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کے ساتھ وعدے کئے ہیں اور وعید بھی کی ہے۔ چنانچہ قرآن میں واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ

"لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ"

"اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے، جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا" (البقرۃ آیت)

یہاں افعال کی ذمہ داری کا بار انسان پر رکھا گیا ہے۔ وہ اپنے خیر کا کاسب ہے اور شر کو بھگتتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فعل اخلاقی کا صحیح معنی میں اس وقت تک ارتکاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ فاعل اپنے فعل کا ذمہ دار نہ ہو۔ اگر ایک شخص سو رہا ہے یا اسکو دوا دے بیہوشی دی گئی ہے، یا وہ پاگل ہے، یا طفل شیر خوار ہے تو وہ اخلاقیاتی معنی کے لحاظ سے فاعل قرار ہی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کا فعل اختیار اور عقلی ارادہ پر مبنی نہیں۔ اور جب قرآن میں یہ کہا جاتا ہے کہ "اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا" (اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے لئے کی اور برائی کی تو اس کا وبال بھی تم ہی پر ہے)۔ تو

لہ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ کذا فی المشکوٰۃ ۱۲   سلہ صحاح ۱۲

انسان کو اس کے اختیار اور عقلی ارادہ کی بنا پر ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ اسی مفہوم کو امام حسنؓ ظاہر فرما رہے ہیں "ان اللہ تعالی لا یطاع باکراہ و لا یعصی بغلبۃ و لم یھمل العباد من المملکۃ" "اللہ تعالی کی اطاعت بجبر و اکراہ نہیں ہو رہی ہے اور نہ اس کی نافرمانی کسی قوت قاہرہ کی وجہ سے عمل میں آ رہی ہے اور اس نے اپنے بندوں کو اپنے ملک میں بیکار نہیں چھوڑ دیا ہے" "لا اکراہ فی الدین" قرآن کا دستور ہے۔ فعل کے ارتکاب میں جبر ہو تو وہ اخلاقی فعل کیسے کہلایا جا سکتا ہے؟ سہل بن عبد اللہؒ کا ارشاد ہے کہ "ان اللہ لا یقوی الابرار بالجبر و انما قواھم بالیقین" یعنی حق تعالی نے نیکوں کو اطاعت کی قوت جبراً عطا نہیں کی ہے بلکہ انھیں یقین کے ذریعہ قوت دی ہے"۔ اس خصوص میں اکابر صوفیہ میں سے کسی کا یہ قول بمنزلہ قانون قرار دیا جا سکتا ہے:۔

"من لم یومن بالقدر فقد کفر و من احال المعاصی علی اللہ فقد فجر"

"جو قدر پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اور جو معاصی کو خدا کے حوالہ کرتا ہے وہ فاجر ہے"

حق تعالی کی نافرمانی کے لئے آزادیٔ ارادہ کی ضرورت ہے، ان کی نافرمانی ممکن ہے اور جب بھی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہے نافرمانی وقوع پذیر ہو رہی ہے لہذا انسان کو انتخاب اور آزادی حاصل ہے جس کو وہ گناہوں کے ارتکاب کے وقت استعمال کرتا ہے۔

انسان کے اس اختیار کو، حریت کو، جبر سے آزادی کو اقبال بڑے جوش سے پیش کرتے ہیں ؎

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر　　تہ این گنبد گردوں رہے ہست
اگر باور نداری خیز و دریاب　　کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست　　(پیام مشرق)

جاوید نامہ میں ایک نئے انداز سے کہتے ہیں ؎

از ضیاں نقد خودی در باختند　　نکتہ تقدیر را نشناختند
رمز باریکش بحرفے مضمر است　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو، نذر ہوا سازد ترا　　سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست　　قلزمی؟ پایندگی تقدیر تست

اب ہمارے سامنے، اثبات، (Thesis) اور نفی (Anti-thesis) دونوں صاف طور پر پیش کر دے گئے ہیں

انسان اپنے افعال میں مجبور ہے حق تعالی انسان کے خالق ہیں اور اس کے افعال کے بھی خالق ہیں۔ "خلقکم وما تعملون"۔ "بیان"
انسان اپنے اختیار و انتخاب میں آزاد ہے، اسی لئے اپنے افعال کا ذمہ دار ہے، اور اس لئے سزا و جزا کا مستحق ہے۔ "من عمل صالحا فلنفسہ" نیز "افرأیتم ما تحرثون"۔ "نقیض بیان"

اس تضاد کو رفع کرنے کے لئے ہم آپ کو کچھ دیر کے واسطے تجرید فکری کی دعوت دیتے ہیں۔ تفکر بقول ہیگل کے کم زور دماغ

کے لئے اسی قدر مشکل ہے جس قدر کہ کم زور پشت کے واسطے بارگراں کا اٹھانا۔ دونوں مجبور ہیں اور اس کے معذور۔ نہ ایک سے فکر ہوسکتی اور نہ دوسرے سے بوجھ اٹھ سکتا ہے۔ یہاں ہمارا خطاب اہل فکر سے ہے۔ ان چند قضایا پر غور کیجئے: ہمارا یہ تو یقین ہے کہ حق تعالیٰ موجود ہیں اور وہ عالم مطلق بھی ہیں۔ اب عالم کے لئے "علم" اور "معلوم" کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ کے ان تین اعتبارات میں ابتدا ہی سے صاف طور پر تمیز کی جاسکتی ہے۔ وہ اپنے ہی افکار و تصورات کے عالم ہیں، یہی ان کے علم کے معلوم ہیں، معروض ہیں۔ علم بغیر معلومات کے ویسے ہی محال ہے جیسے قدرت بغیر مقدورات کے، سمع بے مسموعات اور بصر بے مبصرات کے۔ حق تعالیٰ چونکہ ازل سے عالم ہیں اور علم بغیر معلومات کے ناممکن لہٰذا ان کے معلومات بھی ازلی ہیں۔ یعنی معلومات "غیر مجعول" یا غیر مخلوق ہیں۔ علم حق تعالیٰ کی ایک صفت ہے، اس کا ان کی ذات سے انفکاک ناممکن ہے، ورنہ حق تعالیٰ کو جہل لازم آئے گا تعالی اللہ عن ذلک چونکہ حق تعالیٰ غیر مخلوق اور ازلی ہیں ان کا علم بھی غیر مخلوق ہے اسی طرح چونکہ ان کا علم کامل ہے لہٰذا ان کے معلومات بھی کامل ہوں گے۔

اب حق تعالیٰ کے معلومات کو فلاسفہ "ماہیات اشیاء" کہتے ہیں اور صوفیہ "اعیان ثابتہ" (یا "صور علمیہ" یا "معلومات حق" یا حقائق الممکنات یا ازل ممکن) یہ جیسا کہ کہا گیا، اولاً غیر مجعول ہیں اور ثانیاً کامل اور عدیم التغیر۔ ظاہر ہے کہ ہر "عین" کی اپنی خصوصیت ہوگی جس کو اس کی فطرت کہا جاسکتا ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں "عین" کی "قابلیت" یا "اقتضا" یا قرآنی اصطلاح میں "شاکلہ" کہا جاتا ہے (قل کل یعمل علی شاکلتہ)

یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ اعیان چونکہ غیر مجعول و غیر متغیر ہیں لہٰذا ان کے اقتضاءات یا قابلیات و شاکلات بھی غیر مخلوق و عدیم التغیر ہیں ؎

"قابلیت بہ جعل جاعل نیست   فعل فاعل خلاف قابل نیست"

سر قدر کو سمجھنے کے لئے بس ان ہی چند قضایا کا سمجھ کر تسلیم کرلینا کافی ہے۔ ہماری رائے میں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس سے آپ کو اختلاف ہوسکتا ہو۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ازل سے ثابت ہے، وہ ازل سے عالم بھی ہیں یعنی صفت علم سے موصوف ہیں۔ چونکہ علم کے لئے معلوم کا ہونا ضروری ہے لہٰذا معلومات حق بھی ازلی ہیں اور غیر مجعول۔ معلومات ہی، ماہیات اشیاء، یا ذوات ممکنات کہلاتے ہیں۔ جب معلومات ازلی ہیں تو ان کی ساری قابلیات بھی ازلی ہوں گی۔

اب تخلیق کا تعلق ارادہ سے ہے۔ تخلیق ارادہ کا عمل ہے۔ حق تعالیٰ کا ارادہ ان کے علم کا تابع ہوتا ہے۔ ان کا ہر فعل تحت حکمت ہوتا ہے اور اس کے لئے فعل کو علم کا تابع ہونا ضروری ہے۔ تخلیق نام ہے حق تعالیٰ کے معلومات یا اعیان کے خارج میں انکشاف کا۔ جو چیز خارج میں منکشف ہو رہی ہے وہ بحیثیت "تصور" یا "معلوم" علم الٰہی میں ازل سے موجود ہے۔ ان ہی معلومات یا تصورات یا اعیان کا جب خارج میں تحقق ہوتا ہے تو ان کا نام "اشیاء" ہوتا ہے۔ اشیاء داخلاً معلوم ہیں۔ خارجاً مخلوق ہیں۔

اپنی انفرادیت اور تعین و تشخص کے لحاظ سے غیر ذات حق ہیں، ذات حق تمام تعینات و تشخصات سے منزہ ہے، لیس کمثلہ شئی وھو السمیع البصیر!

اب ان حقائق کی روشنی میں حدیث جبر و قدر پر نظر ڈالو۔ تخلیق حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی، لیکن اشیاء کے اقتضاءات یا قابلیات کے مطابق ہو رہی ہے۔ اشیاء کی یہ قابلیات بے جعل جاعل ہیں یعنی غیر مخلوق و ازلی ہیں، ان کو کسی نے مجعول نہیں کیا۔ یہ اپنے اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہیں نہ کہ مجبور۔ یہی باریک بات جبری کی سمجھ میں نہیں آتی وہ اپنے عین یا ذات کو بھی مجعول و مخلوق خیال کرتا ہے، اپنی خصوصیات و قابلیات کو بھی آفریدہ سمجھتا ہے، حالانکہ یہ معلوم الٰہی ہونے کی وجہ سے ازلی ہیں، اگر یہ ازلی نہ ہوں، اور یہ جعل جاعل مجعول ہوں تو ضروری ہوگا کہ قبل جعل سلب ہوں گے، جو چیز سلب ہو وہ ہمیشہ سلب ہوگی موجود نہیں ہو سکتی، ورنہ قلب حقیقت لازم آئے گا، اور یہ محال و باطل ہے۔ اگر جبری اس نکتہ کو سمجھ لے تو وہ پھر یہ نہ کہے گا کہ میری فطرت اس طرح کیوں بنائی گئی، فطرت، جس کو ہم اصطلاحی الفاظ میں عین ثابتہ یا معلوم کہتے ہیں بنائی نہیں گئی، وہ مجعول ہی نہیں، یہ اور اس کے تمام اقتضاءات و قابلیات بے جعل جاعل ہیں اور اس طرح وہ اپنے اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہے۔ لیکن ان قابلیات و خصوصیات کو حق تعالیٰ خارج میں ظاہر کر رہے ہیں وجود بخشی ان کی جانب سے ہو رہی ہے۔ تخلیق ہمیشہ اللہ ہی کا فعل ہے "خلقکم وما تعملون"۔

اوپر جو کچھ کہا گیا اس کو ایک جملہ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہی سرّ قدر ہے۔

"لا یمکن بعین ان یظھر فی الوجود ذاتاً صفۃ و فعلاً الا بقدر خصوصیتہ و اھلیتہ واستعدادہ الذاتی" (شیخ اکبر)

یہاں جبر و قدر دونوں میں تطبیق ہو رہی ہے۔ اعیان ثابتہ جو معلومات حق ہیں (اور حق تعالیٰ انکے عالم ہیں) اپنی خصوصیات و قابلیات و استعدادات کے موافق ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ ہے اختیار اور آزادی کا پہلو، لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ سے ہو رہا ہے، یہ ہے جبر کا پہلو!

دیکھو "حرکت ایک ہے اور نسبت دو"۔

ایک نسبت حق کی جانب ہے۔ یہ نسبت تخلیق ہے۔ جملہ افعال کی تخلیق حق تعالیٰ کر رہے ہیں۔ فاعل حقیقی وہی ہیں ذات خلق میں نہ حرکت ہے نہ قوہ "لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ بمعنی حرکت" "تخلیق افعال میں انسان مجبور ہے"۔ "ہمہ از دست"

دوسری نسبت خلق کی جانب ہے یہ نسبت "کسب" ہے، یعنی افعال کی تخلیق عین ثابتہ یا ماہیت شئی کے بالکل مطابق ہو رہی ہے، بالفاظ دیگر جو کچھ عین میں ہے بہ فعلیت خالق وہی ظاہر ہو رہا ہے، یا یوں کہو ہر شئی کی فطرت کے مطابق ظہور ہو رہا ہے جب تمام وقوعات میری اقتضاء کے موافق ہو رہے ہوں اور کوئی شئے میری فطرت کے خلاف مجھ پر عاید نہیں کی جا رہی ہے تو پھر میں صحیح معنی میں آزاد ہوں اسی لئے شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ ما یحکم علینا الا بنا بل نحن نحکم علینا بنا" "جو کچھ ہم پر حکم لگایا جا رہا ہے وہ ہماری فطرت کے

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

سنہ ۱۳۵۹ھ